استفسارات

احمد جاوید

استفسار

محترمی، السلام علیکم!

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

(''ذوق وشوق''، بال جبریل)

اس شعر میں 'شوق ترا' سے کیا مراد ہے؟ نیز اگر اس شعر کو بانگ درا کے اس شعر کے تناظر میں دیکھیں:

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

تو 'شوق ترا' کا مفہوم کیا ہوگا؟

[محمد فاروق رانا، لاہور]

جواب:

آپ نے ذوق وشوق کے جس شعر کا حوالہ دیا ہے اس میں بعض حضرات نے ایک مصنوعی اشکال پیدا کر کے اقبال کی شاعری پڑھنے والوں کے لیے ایسے خلجان کا سامان کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہمارا شعور اس شعر کی مراد اور اس سے پیدا ہونے والی معنوی اور احوالی تاثیر کو قبول کرنے میں رکاوٹ اور تذبذب محسوس کرتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ذوق و شوق ایک نعتیہ نظم ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتہاے طلب بنا کر ایک طالبِ صادق کے سفر کی انفسی اور آفاقی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس نظم میں صیغۂ تخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور اس میں کہیں کوئی استثنا روا نہیں رکھا گیا۔ جہاں بھی 'تُو' کا کلمہ آیا ہے وہاں مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ اس شعر میں 'شوق ترا' سے ایک مراد تو یہ ہوسکتی ہے کہ 'تیرا شوقِ عبودیت و عبادت ـــــ اور دوسرا مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ 'وہ شوق جو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل کرنے کے لیے رکھتا ہوں۔' پہلا مطلب پیش نظر ہو تو اس شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ شوقِ بندگی جو آپؐ کی شخصیت میں ہی راسخ تھا اور اعمال سے بھی ظاہر تھا، اگر نماز میں امامت کی تاثیر کے ساتھ قبلۂ توجہ نہ رہے تو نماز کی حقیقت ہی غائب رہے گی اور صورت بھی مسخ ہو جائے گی۔ گویا بندگی شروع سے آخر تک آپؐ کو واحد نمونۂ کامل کی حیثیت سے مستحضر رکھنے کا نام ہے۔ 'حجاب' کا لفظ بھی بہت معانی خیز ہے ـــــ یعنی اللہ کا حضور مشروط ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے۔ آپؐ کا استحضار ہی اللہ کے حضور کو واقعی بناتا ہے۔ یہ نہ ہو تو یہ سارا حضور ایک واہمے سے زیادہ کچھ نہیں۔

'شوق ترا' میں شوق کی نسبت متکلم کی طرف کی جائے تو شعر کا مضمون یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو آخر تک رہنما بنائے بغیر بندہ نہ ایمان کے حقائق تک پہنچ سکتا ہے اور نہ مظاہر تک ـــــ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبتِ حُبی کو مدار بنائے بغیر اللہ سے تعلق کی کوئی باطنی یا ظاہری اصل باقی نہیں رہتی۔ 'امام' کے لفظ کی معنویت اس مفہوم کی تشکیل میں بہت بنیادی کردار رکھتی ہے۔ یعنی آپؐ کی کامل اقتدا اور اتباع نصیب نہ ہو تو آدمی اس راستے پر نہیں چل سکتا جو اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ اقتدا و اتباع اسی محبت سے میسر آتی ہے جسے اس شعر میں 'شوق' کہا گیا۔

میں 'شوق ترا' کو عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی میں لیتا ہوں۔ یہ بند اور اس سے پہلے کا بند دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس عارفانہ یکسوئی اور عاشقانہ انہماک کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کو بندگی کی ایک بنیادی قدر اور عبودیت کے ایک مستقل مقصود کے طور پر برقرار رکھا جائے۔ 'شوق' کی نسبت اگر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دی جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب کے مرتبے سے عاشق کے درجے پر آجائیں گے اور منتقلی کا یہ عمل کسی تمہید کے بغیر ایک ناگوار جھٹکے کی طرح محسوس ہوگا۔ یہ بیان کا وہ نقص ہے جو اس سطح کے مضمون میں کم از کم اقبال کے ہاں تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ شعر جس بند میں آیا ہے، اس کا سرسری سا تجزیہ بھی یہی بتاتا

ہے کہ اس شعر میں اقبال نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الخاص امتیازات اور مقامات میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپؐ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کائناتِ وجود اور اس کے تمام مراتب میں ایک فعال مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عالمِ امر ہو یا عالمِ خلق ہو یا عالمِ حق، وجود کے یہ تینوں مراتب تین دائروں کی طرح ہیں جن کا مرکز واحد ہے، یعنی حقیقت محمدیہ ـــــ تفصیل کا موقع نہیں ہے، مختصراً اتنا سمجھ لیجیے کہ اقبال کے تصورِ وجود کے مطابق ہر مرتبۂ ہستی ایک خاص نظامِ حرکت سے بھی عبارت ہے جو اُس مرتبے کو دیگر مراتب کے ساتھ مربوط رکھتا ہے۔ یہ اُصولِ حرکت مراتب کے امتیاز سے متاثر نہیں ہوتا اور اپنی ماہیت میں واحد ہے۔ اقبال کی نظر میں حقیقتِ محمدیہ اسی اُصولِ حرکت کا نام ہے۔ گو کہ حقیقتِ محمدیہ کی یہ شان ہماری عرفانی روایت میں طرح طرح سے بیان ہوئی ہے لیکن حضرتِ مجدد الف ثانی کے زیرِ اثر اقبال اس حقیقت کو ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی میں لیتے ہیں۔ گویا حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر اعتبارات، یعنی مابعد الطبیعی معانی، اقبال کے ہاں ذاتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بن جاتے ہیں۔ علامہ کے اس امتیاز کو نظر انداز کر دینے سے بعض حضرات نے اس شعر یا اس بند کا فوقِ انسانی شکوہ دیکھ کر اس غلط فہمی میں پڑنا قبول کر لیا کہ یہ کلام حمد ہے، نعت نہیں ہے۔

ذرا پورے بند کا تجزیہ کر کے دیکھیے۔ اقبال نے وجود کے تینوں دائروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت اور ذات کی فعال مرکزیت کو کیسی جمالیاتی رفعت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پہلا شعر یعنی ''لوح بھی تُو قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب'' میں دائرۂ امر اور اس کی مرکزیت کا بیان ہے..... دوسرے اور تیسرے شعر میں دائرۂ خلق اور اس کے مرکز کا ذکر ہے..... اور چوتھے اور پانچویں شعر میں دائرۂ حق میں حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے اور اُس مرتبے کے ظہور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آپ نے بانگ درا سے جو شعر نقل کیا ہے وہ اقبال نے نوجوانی میں کہا تھا۔ اسی لیے مضمون بھی خام ہے اور اظہار میں بھی پختگی نہیں ہے۔ 'ذوق و شوق' تک آتے آتے اقبال تصور سازی اور قدرتِ کلام میں اپنے منتہا کو پہنچے ہوئے ہیں، وہی مضمون بالآخر درست اور کامل ہو کر زیرِ نظر شعر میں بیان ہو گیا ہے۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثل عظمت کا جو احساس بانگ درا کی نظم 'بلال' میں ظاہر ہوا تھا، اسی نے شعور کی بلند ترین سطح سے گزر کر 'ذوق و شوق' کے اس شعر میں ظہور کیا ہے۔

❁.....❁.....❁

استفسار

علامہ اقبال کے کچھ موضوعات طویل اور مسلسل مطالعے کے باوجود اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں

آ سکے۔ نثر میں زبان کا مسئلہ اور شاعری میں رومی کی روحانی اور فکری امامت کا مسئلہ —— ان کے علاوہ بھی کچھ باتیں گرفت سے باہر معلوم ہوتی ہیں لیکن ان دو معاملات میں ذہن کہیں ٹکنے نہیں پاتا۔ اقبال کے تصورِ زمان پر تو میں باقاعدہ سوالات قائم کر کے بعد میں ارسال کروں گا، اس وقت آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اقبال نے رومی کے ہاں ایسی کیا چیزیں دیکھی تھیں کہ انھیں اپنا مرشد بنانے پر راضی ہو گئے؟ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ضربِ کلیم میں ایک جگہ رومی سے دوری کو گویا ہمارا وجودی اور روحانی نقص قرار دیا ہے:

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک
ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک
کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک
گُسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک!

[رومی، ضربِ کلیم، ص۶۳۳]

رومی کے بارے میں یہی معتقدانہ جوش اقبال کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ مجھے خدانخواستہ اس پر اعتراض نہیں بلکہ محض مولانا روم کے وہ نظریات جاننا چاہتا ہوں جنھوں نے اقبال ایسے تقلید دشمن مفکر اور شاعر کو اپنا اسیر بنا لیا۔

آپ کی بڑی نوازش ہوگی اگر اس گتھی کو سلجھانے میں میری راہنمائی فرمائیں۔

[ارشاد المجیب، لاہور]

جواب

رومی سے اقبال کی پُر جوش ارادت کے ٹھوس اسباب جاننے کی کوئی سنجیدہ کوشش واقعی نہیں کی گئی۔ دیگر مفکرین کے ساتھ اقبال کی حقیقی یا فرضی نسبت کو کھنگالا جاتا رہا ہے لیکن اس سوال پر گہرائی میں جا کر کم ہی غور کیا گیا ہے کہ آخر رومی سے چلنے والی وہ روایت کیا ہے جس کا اقبال اپنے آپ کو ایک نمایندہ کہتے ہیں۔

میرے خیال میں ہماری عارفانہ روایت میں مولانا روم اس اعتبار سے بھی منفرد اور ممتاز ہیں کہ انھوں نے مابعد الطبیعی حقائق اور معارف کے وسیع ترین دائرے کو ایک خاص مفہوم میں انسان مرکز بنا کر دکھایا۔ ان کی بے مثل عرفانی اور عشقیہ قوتوں کا رُخ ہمیشہ تعمیرِ آدم کی طرف رہا۔ غالباً یہی وہ وصف ہے جس نے

اقبال کو رومی کا مرید بنا دیا اور ان کے سب سے بنیادی تصور یعنی تصورِ خودی کی تشکیل ایک وسیع تر مابعد الطبیعی سیاق وسباق میں ممکن بنا دی۔

مثنوی مولانا روم دراصل انسان کی مابعد الطبیعی سرگذشت ہے جس میں حقیقت کے تمام مراتب کا بیان بھی سمٹ آیا ہے۔ اسی طرح دیوان شمس حقیقتِ انسانی کی کائنات کا ایسا سفرنامہ ہے جس میں خدا کے عالم در عالم کی سیر بھی ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اقبال کی نظر میں شاید رومی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ وجود اور حقیقت کے دائرے کو انسان کے نقطے سے شروع کرتے ہیں اور اسی پر تمام کر دکھاتے ہیں۔

رومی شناسی کی روایت میں اندیشہ ہے کہ یہ قبول نہیں کیا جائے گا کہ مولانا کے حقائق و معارف انسان مرکز ہیں یا وہ وجودِ انسان کو مابعد الطبیعی منتہا پر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اُس روایت کی تفصیل میں نہیں جائیں گے کیونکہ سردست ہمیں اقبال کے رومی سے سروکار ہے، یہ تحقیق ضروری نہیں کہ اقبال کا رومی، روایتی رومی سے مختلف کیوں ہے اور اس اختلاف میں رومی فہمی کے زیادہ قابلِ اعتماد اور مستند مظاہر کہاں پائے جاتے ہیں۔ اقبال کے نقطۂ نظر سے مولانا روم کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے مقامات پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ گویا اقبال کا کلام ہے جو ان کے معلوم کلام کے مقابلے میں صورتاً مختلف ہے اور باعتبارِ معنی بلند تر اور عمیق تر۔ اپنی نظم ''پیر و مرید'' میں اقبال نے رومی کی مثنوی سے بعض فلسفیانہ اور تہذیبی سوالات کے جواب نکالے ہیں۔ ان میں سے بعض مسائل فکرِ اقبال کی تشکیل میں بہت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مسائل کی طرف ہم بعد میں جائیں گے، فی الحال مولانا روم کی عارفانہ اور عاشقانہ شاعری کے معنوی نظام اور اس کے امتیازی پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

رومی کا معنوی نظام شعور کی کسی خاص نوع یا علم کے کسی مخصوص شعبے میں محدود نہیں ہے۔ ابن عربی کی طرح رومی بھی اس مجموعی شعور کے مرکز سے کلام کرتے ہیں جہاں حقائق کو دو چار میں سے ایک روزن سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ وہ کلی تناظر عمل میں لایا جاتا ہے جو حقائق کو کسی علمی مطالبے کی تسکین کا ذریعہ بنانے کے بجائے انھیں ہمارے مجموعی شعور کی تحویل میں دے دیتا ہے۔

یہ مجموعی شعور حقیقت کو تصور بنانے کا کام نہیں کرتا بلکہ اس کی روبروئی کو عقل وغیرہ کے لیے واجب القبول بناتا ہے۔ حقیقت یہاں معلومیت کی زد سے ماورا ہو کر اپنی شانِ وجود کے ساتھ منکشف ہوتی ہے اور یہ انکشافات شعور کی تمام انواع کو اس چشمے کی طرح سے سیراب کرتا ہے جو زمین پر نہیں ہے مگر زمین کی شادابی اُسی پر منحصر ہے۔

شعور کے تمام مطالبات کی تکمیل کا ماخذ ہمیشہ اس سے باہر ہوتا ہے۔ اس ماخذ سے ایک تخلیقی اور مؤثر نسبت پیدا کرنے کے لیے شعور اپنی مختلف قوتوں کو ان سے ماورا لے جا کر ایک ہیئتِ وجدانی میں ڈھل جاتا

ہے جو اسے وہاں تک پہنچنے کے قابل بنا دیتی ہے جہاں صورت اور علم کے اعتباری ہونے کا اور معنی اور وجود کے حقیقی ہونے کا مشاہدہ میسر آتا ہے۔ برسبیل تذکرہ عرض ہے کہ صوفیا کی مشہور اصطلاح ''حیرت'' اسی مشاہدے سے پیدا ہونے والا وہ حال ہے جہاں وجود اپنا غلبہ قائم رکھتے ہوئے علم کو خود میں سمو لیتا ہے۔ رومی کا ہر سخن اسی مقام سے ہے۔ ان کا ہر بیان اپنے فوری مدلولات کا احاطہ کرتے ہوئے ان گہرائیوں میں جذب ہو جاتا ہے جو شعور میں حقائق کا مسکن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رومی کے کینڈے کا Symbolist کسی عرفانی اور حکیمانہ روایت میں کم ہی نظر آتا ہے۔

سمبل ازم کا مطلب ہی یہ ہے کہ صورت کا مکمل احاطہ کرتے ہوئے حقیقت کی طرف محکم اشارہ ہو جائے۔ یہی مجموعی شعور کا خاصہ ہے جس سے عقل وغیرہ کے وہ تقاضے پورے ہوتے ہیں جن کی تکمیل کا کوئی سامان ان کے پاس نہیں ہے۔ رومی کے بے مثال سمبل ازم ہی کا کرشمہ ہے کہ حقیقت کی طرف مظاہری انداز سے پیش رفت کرنے والے لوگ بھی ان کی اقتدا کا دم بھرتے ہیں اور حقیقت کی ماورائے ظہور بلندیوں کی طرف پرواز کرنے والے حضرات بھی انھیں اپنا امام مانتے ہیں۔ ذہن کی جتنی بھی قسمیں ہو سکتی ہیں، آپ کر لیجیے ـــــ اس کے بعد رومی کو پڑھیے تو صاف محسوس ہوگا کہ یہ شخص ہر ذہن کو اس کے مسلمات فراہم کر رہا ہے۔ اسی بلاقید فیاضی نے اقبال کو بھی ان کا مرید بنا دیا۔

جاوید نامہ اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ایک تو اقبال کی فکر مکمل صورت میں اظہار پا گئی ہے اور دوسرے اقبال کے ان مطالبات کی فہرست بھی بن گئی ہے جن کی تکمیل رومی کی راہنمائی میں ہوئی۔ اقبال پر رومی کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ جاوید نامہ کو بنیادی حوالہ بنایا جائے۔ اس کتاب میں رومی کے معنوی فیضان کی پوری تفصیل موجود ہے مگر اس پر کچھ پردے پڑے ہوئے ہیں جنھیں اُٹھانا ہوگا۔ اور یہی نہیں، جاوید نامہ کا دروبست بھی رہ رہ کر مثنوی مولانا روم کی یاد دلاتا ہے۔ مثلاً جاوید نامہ کا آغاز ہی مثنوی کے نقش قدم پر ہے۔ پہلا شعر ہی واضح طور پر مثنوی کے مطلع کی باز گشت ہے۔ اس کے علاوہ ''مناجات'' کا پہلا بند مثنوی کے ابتدائی اشعار کی برنگ دیگر تفسیر ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

آدمی اندر جہاں ہفت رنگ
ہر زماں گرم فغاں مانندِ چنگ
آرزوے ہم نفس می سوزدش
نالہ ہاے دل نواز آموزدش

[مناجات، جاوید نامہ]

بشنو از نے چوں حکایت می کند
و ز جدائیہا شکایت می کند

[مثنوی مولانا روم]

رومی کے شعر کو اس کے عرفانی سیاق و سباق سے ذرا دیر کے لیے نکال دیجیے تو اس میں عین وہی کچھ کہا گیا جو جاوید نامہ کے ان دو شعروں میں بیان ہوا ہے۔ رومی نے آدمی کو 'نَے' کہا ہے اقبال نے اسے 'چنگ' سے بدل دیا۔ جس 'ہم نفس' کی آرزو اقبال کر رہے ہیں رومی بھی اُسی کے طالب ہیں مگر اقبال کے لیے یہ 'ہم نفس' دنیا میں اُتارے گئے انسان کی وجودی عظمت کے اسرار جاننے والا کوئی ایسا وجود ہے جو اس کی وہ تنہائی بانٹ سکے جو ہستی کے منتہا پر ہونے کی وجہ سے اسے لاحق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود رومی کو ایسا ہم نفس مطلوب ہے کہ نہیں۔ سرِدست یہ دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اقبال کی 'فغاں' رومی کی شکایت و حکایت سے کس حد تک ماخوذ ہے۔ میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ مکمل طور پر۔